جلد ۸۲ دسمبر ۱۹۷۴ء عدد ۴

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۲ | دسمبر ۱۹۷۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ | عدد ۴

اشارات

	عبدالحمید صدیقی	۲
قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت	ابوالاعلیٰ مودودی	۹

مقالات

تحریک اور جمود	جناب سید اسعد گیلانی	۳۱
رسائل و مسائل	جناب ملک غلام علی	۳۸
مطبوعات	عبدالحمید صدیقی	۴۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ہم نے آمریت کے ان ہتھکنڈوں کا ذکر کیا تھا جن کی مدد سے وہ کسی ملک اور قوم پر مسلط ہو کر اُن کے لیے عذاب بنتی ہے ۔ ان صفحات میں ہم اشتراکیت کی ان ریشہ دوانیوں اور چالبازیوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ ایک محدود سی اقلیت کسی ملک اور قوم کی عظیم اکثریت کے حقوق کو پامال کر کے، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے خون سے ہولی کھیل کر اور اس کی زندگی کے مختلف دائروں میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا کر نہایت ہی ظالمانہ اور سفاکانہ حربوں کے ساتھ نہ صرف تختِ اقتدار پر متمکن ہوتی ہے، بلکہ اس کی معیشت، معاشرت، تمدن اور ثقافت یہاں تک کہ اس کی رُوح کو بھی اپنی آہنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔

مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت بلاشبہ ایک بُرائی ہے، آمریت بھی ایک قہر ہے جو کسی قوم یا ملک پر نازل ہوتا ہے لیکن یہ بات بلاخوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ جس نظام کو دنیا سوشلزم یا سائنٹفک سوشلزم کے نام سے جانتی ہے وہ ایک ایسا دردناک عذاب ہے جس کی قہرمانیوں کا کچھ وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن پر یہ عذاب مسلط ہوا ہے ۔ انسانیت کے جو گروہ اس کی لپیٹ میں ابھی تک نہیں آئے ان کی اچھی خاصی تعداد اس کے استبداد کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے اور بعض بدنصیب افراد اس باطل نظام کے گماشتوں کی پھیلائی ہوئی خوش فہمیوں کی وجہ سے اس کے بارے میں کسی حد تک حسنِ ظن بھی رکھتے ہیں ۔ اسے دَورِ جدید کے دیگر عجائبات کی طرح کذب اور دروغ گوئی کے فن کا کمال سمجھیے کہ جو حقائق دن سے زیادہ روشن ہیں انہیں جھوٹے پراپیگنڈے کی مدد سے عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جا رہا ہے ۔ یا اُن کے بارے میں اُن کے ذہنوں پر غلط قسم کے اثرات

مرتب کیے جا رہے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کے بارے میں متعدد الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں کہ اگر ایک برائی کو قوت مہیا کر کے سہ آتشہ کر دیا جائے تو وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوفناک ثابت ہوتی ہے۔

سرمایہ داری ایک لعنت ہے جس نے کسی معاشرے کے اندر سرمایہ داروں کی جھوٹی کبریائی کو جنم دیا ہے اور جس کی وجہ سے معاشرے کی عظیم اکثریت مختلف قسم کی محرومیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس طرح آمریت بھی ایک عذاب ہے جو ایک شخص کی خدائی اور باقی سب افراد کے انسانی حقوق کی پامالی کی صورت میں کسی ملک اور قوم پر مسلط ہوتا ہے۔ فنی اصطلاحات کی فریب کاریوں کا اگر پردہ چاک کر کے اشتراکیت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظام بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ سرمایہ داری کی لعنت اور آمریت کا عذاب دونوں یکجا ہو کر کسی قوم اور معاشرے کو اپنے خوفناک شکنجے میں لے لیتے ہیں۔ اگر سرمایہ کا چند ہاتھوں میں ارتکاز کسی معاشرے کے اندر لاتعداد برائیوں کو جنم دے سکتا ہے تو کسی قوم کے کل سرمائے اور ذرائع پیداوار کی اُن ہاتھوں میں تحویل جو آمرانہ عزائم رکھنے کے ساتھ ساتھ کسی ملک کے مطلق العنان فرمانروا بھی ہوں کس طرح کسی معاشرے کے لیے خیر اور بھلائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت اور آمریت کا عذاب اگر الگ الگ ہوں تو وہ انسانوں کے لیے جہنم ہیں لیکن جب یہ لعنت اور عذاب دونوں ایک ہی نظام کے اندر سمو دیے جائیں تو وہ جنت کا نقشہ پیش کرنے لگیں۔ اس آسمان کے نیچے اس سے بڑی ابلہ فریبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

ظاہر بات ہے کہ اس نوعیت کے غیر فطری اور ظالمانہ نظام کے تسلّط کو کوئی قوم برضا و رغبت تو قبول نہیں کر سکتی اس لیے اسے ہمیشہ سازشوں کے ذریعہ آگے بڑھا کر کسی قوم پر مسلط کیا گیا ہے۔ اگر آپ اس نظام کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نفرت اور منفی انداز فکر نے اس نظام کو جنم دیا، مکر و فریب نے اس کی آبیاری کی، سازشوں نے اسے پروان چڑھایا اور تشدد کے بل بوتے پر یہ نظام کسی معاشرے میں ایک غالب قوت بننے میں کامیاب ہوا۔ چنانچہ یہ نظام اپنی توسیع و ترقی اور حفظ و بقا کے لیے کبھی وہ راستہ اختیار نہیں کر سکتا جو دنیا کے صحت مند نظام کرتے رہے ہیں کہ پہلے ایک نظریہ کا پرچار کیا جائے اور جو لوگ اس نظریے کی صحت کے قائل ہو کر اُسے اپنانے پر رضامند ہو جائیں ان کے ذریعے اسے

ایک مؤثر قوت بنایا جائے اور پھر ان کی تائید اور حمایت سے اس نظریے کے تقاضوں کے مطابق معاشرے کی ہیئت کو تبدیل کیا جائے۔ اشتراکیت تو سارا کھیل ہی چالبازی، سازش اور تشدد کا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اشتراکیت کی بنیادی دعوت پر ہی غور فرمائیں تو آپ یوں محسوس کریں گے کہ آپ کسی داعی کا پیغامِ حق نہیں سن رہے بلکہ دھوکہ بازوں کے نرغے میں گھر گئے ہیں۔ ایک سمت سے آپ کے کانوں میں یہ آواز آتی سنائی دے گی کہ "اشتراکیت محض غریبوں کے دکھوں کا مداوا ہے اور یہ نظام کسی مذہب سے کوئی تعرض نہیں کرتا، دوسری سمت سے آپ یہ صدا سُنیں گے کہ اشتراکیت کا مقصد لوگوں کو مذہب اور اس کے طلسمات سے آزاد کرانا ہے۔ ایک طرف اشتراکیت کے جمہوری مزاج کے تذکرے ہوں گے اور دوسری طرف اس کی آمرانہ ہیئت کی خوبیاں گنوائی جارہی ہوں گی۔

اشتراکیت کی بنیادی دعوت کی طرح اس کے افکار و تصورات اور اس کے عملی مضمرات میں بھی ہر قدم پر کھُلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے۔ یوں تو اس ضمن میں متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن میں تاریخ کی اشتراکی تعبیر سے ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے اشتراکیوں کی پریشان فکری اور پریشان نظری کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اشتراکیت مذہب کی کس قدر دشمن ہے اسے ہر وہ شخص اچھی طرح جانتا ہے جو اس کا تھوڑا سا مطالعہ بھی رکھتا ہے۔ اشتراکیت کے علمبرداروں نے جتنی گالیاں مذہب اور اہلِ مذہب کو دی ہیں وہ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کو بھی نہیں دیں۔ یہ لوگ مذہب کو تمام بُرائیوں کی جڑ، ساری بے انصافیوں کا منبع اور انسانیت کی ساری محرومیوں کا واحد سبب سمجھتے ہیں لیکن ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ جہاں مذہب کی تائید کے بغیر بات بنتی نظر نہ آئے وہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مذہبی اصطلاحات اور مذہبی معتقدات وافکار سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر کسی مذہبی معاشرے پر شبخون مارتے ہیں۔ منافقت کا یہ رنگ دوسرے اور تیسرے درجے کے اشتراکیوں ہی میں نہیں بلکہ ان کے صف اوّل کے رہنماؤں اور مفکرین کے افکار و اعمال میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔

اشتراکیت میں تاریخ کی مادی تعبیر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو مذہب میں عقیدے کو حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر دوسرے نظامہائے حیات کی طرح اشتراکی نظام کے بارے میں بھی اس بات کی بجا طور پر توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس کے علمبردار کم از کم اپنے اس بنیادی عقیدے سے کسی مرحلہ پر اور کسی دائرے میں بھی انحراف پر تیار نہ ہوں گے۔ لیکن افسوس اس معاملے میں بھی انہوں نے کسی اخلاص، ذہنی اور فکری ہمواری اور استقامت کا ثبوت

نہیں دیا بلکہ اپنے اس اساسی تصور سے قدم قدم پر اس طرح انحراف کیا ہے کہ انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس نظام کی کوئی فکری اور اعتقادی اساس بھی ہے یا یہ محض طالع آزمائی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی مشق ہے۔

اگر مذہب انسانوں کے لیے فی الحقیقت افیون ہے تو جو لوگ اس کے داعی ہیں ان کا شمار ہمیشہ انسانیت کے دشمنوں کی صف میں ہونا چاہیے لیکن مذہبی حلقوں کو اپنے دام میں پھانسنے کے لیے اشتراکی منکرین ایک ہی سانس میں مذہب پر لعن طعن بھی کرتے ہیں اور مذہب کے علمبرداروں کی اس انداز سے مدح و ستائش بھی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ادوار میں نہ صرف طبقاتی شعور کو جلا دی بلکہ اس کے تقاضوں کو بھی اچھی طرح پورا کیا۔ ہندوستان کے مشہور اشتراکی مفکر ایم۔ این۔ رائے نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخی کردار پر جو کتاب تصنیف کی ہے اس میں یہ طرز فکر خاص طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ مذہب کے معاملے میں کھلی ہوئی منافقت نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک طرف تو مذہب کو افیون کہا جائے اور دوسری طرف اس کے علمبرداروں کے کارناموں کی اس اعتبار سے تعریف کی جائے کہ انہوں نے انسانوں کو اپنے مخصوص دور میں اشتراکی نقطۂ نظر سے طبقاتی شعور عطا کیا۔ اگر مذہب انسانیت کے لیے سم قاتل ہے تو پھر جو لوگ یہ زہر کسی معاشرے کے رگ و پے میں پھیلاتے ہیں وہ کبھی محسن انسانیت نہیں ہو سکتے اور اگر وہ فی الحقیقت محسن انسانیت ہیں تو اس صورت میں وہ جن معتقدات، جن افکار و نظریات کی صحت پر مہر ثبت کر رہے ہیں وہی صحیح اور برحق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ موجود ہے وہ سراسر باطل اور کذب و فریب ہے۔

اشتراکیت کے علمبرداروں کی یہ کھلی ہوئی منافقت دنیا کے ہر اس حصے میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہے جس میں انہیں کام کرنے کے کوئی مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں ان کی سازشوں کو نظر انداز کر کے اگر صرف پاکستان میں ان کی" سرگرمیوں" کا مطالعہ کیا جائے تو اشتراکی فکر و عمل کے بہت سے بھیانک گوشے سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پیشتر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی عظیم اکثریت کانگریس کی صفوں میں موجود تھی اور مسلم لیگ کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی جماعت کے طعنے دیے جاتے تھے لیکن جس وقت سرخ فوج کے جیالوں کو اس امر کا احساس ہوا کہ اب اس جماعت کی جدوجہد لازمی طور پر پاکستان کے قیام پر منتج ہو گی تو یہ جیالے کانگریس کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ کی صفوں میں آگھسے اور اپنی اس بے اصولی کو اس بھونڈی دلیل کے ذریعے چھپانے کی کوشش کی کہ اب طبقاتی شعور اس بات کا متقاضی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندو سے

الگ ہو کر اپنی ایک نئی دنیا آباد کریں۔ چنانچہ بڑے کٹر قسم کے اشتراکی جن کی عمریں مارکس اور لینن کا کلمہ پڑھتے ہوئے گزری تھیں وہ مسلم لیگ کے قافلہ سالار بن گئے اور عوام کے اندر اپنی حیثیت کو اس طرح نمایاں کرنے میں سرگرم عمل ہوئے کہ پاکستان کے افق پر قائداعظم کے بعد ان کی شخصیتیں ہی سب سے زیادہ تابندہ نظر آئیں اور وہی عوام الناس کی محبت اور عقیدت کا مرکز بنیں۔

ان لوگوں نے اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کر کے پاکستان میں اشتراکی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی بھرپور کوششیں شروع کیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو ناپاک سے ناپاک حربے بھی کام میں لائے جا سکتے تھے انہیں بڑی عیاری کے ساتھ استعمال کیا۔ ان میں سے ایک گروہ نے اپنا یہ شیوہ بنایا کہ جو حکومت بھی قائم ہو اس کی مدح سرائی کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ دنیوی فوائد حاصل کیے جائیں اور خصوصاً اس کی مدد سے ذرائع ابلاغ اور شعبہ تعلیم پر پوری طرح قبضہ کر لیا جائے۔ اس میدان میں اشتراکیوں کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ اگر ریڈیو، ٹیلیویژن اور سرکاری اخبارات کے کارکنوں کا جائزہ لیں تو آپ کو وہاں اشتراکیوں کی بڑی مستعد سپاہ مصروف عمل نظر آئے گی۔

اشتراکیت کے ان کارندوں نے بڑی چابکدستی سے ان مختلف محاذوں پر کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ ہمیشہ اس بات پر مرکوز رکھی ہے کہ پاکستان کے حقیقی نصب العین یعنی اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں قوم کے اندر شدید انتشار پیدا کیا جائے اور اسے اسلامی اقدارِ حیات سے متنفر کر کے لادینی اقدار کا گرویدہ بنایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ لوگ مختلف قسم کی فریب کاریوں سے کام لیتے چلے آرہے ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی نظام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ کبھی مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کے سامنے یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ کیا پاکستان میں اس نظام کو قائم کیا جائے جو دس برس بھی کامیابی سے نہ چل سکا، کیا آج ہماری جگ ہنسائی نہ ہوگی اگر ہم ایک ایسے نظام کے تحت زندگی بسر کرنا گوارا کر لیں جو غلام اور لونڈیاں رکھنے اور ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ رشتہ مناکحت استوار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ کیا یہ دیوانگی نہیں کہ چودہ سو برس بیشتر کے اصول و ضوابط کو جو ایک بالکل غیر مہذب معاشرے کے لیے وضع کیے گئے تھے انہیں دورِ جدید کے ترقی یافتہ معاشرے پر نافذ کر دیا جائے، کیا اس کے نفاذ سے مسلمان صدیوں پیچھے نہ جا پڑیں گے اور اس طرح ان سارے فوائد سے اپنے آپ کو محروم نہ کر لیں گے جو دورِ جدید

کے سائنسی کمالات کے رہین منت ہیں۔

نوجوانوں کے اندر اس نوعیت کی متعدد ذہنی الجھنیں پیدا کرنے کے علاوہ ان حضرات نے مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک کیا ہے جو کسی متعصب سے متعصب غیر مسلم مستشرق کو تو شاید زیب دیتا ہو لیکن کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ مسلم قوم کے سب سے زیادہ تابناک دور کو قتل و غارت اور فتنہ و فساد کا دور ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں اور اس کے مقابلے میں ایک منصوبے کے تحت ایسے ادوار کو نمایاں کرنے میں اپنی ذہانت کے جوہر دکھائے گئے جو غیر اسلامی سرگرمیوں کے لیے تو ممکن ہے اپنے اندر کوئی کشش رکھتے ہوں مگر اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کسی اہمیت کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے۔ مسلمانوں کا جو فرمانروا جس قدر زیادہ بگڑا ہوا انہیں نظر آیا انہوں نے اس کی کرتوتوں کو ستائش کا رنگ دے کر خوب اچھالا تاکہ مسلم قوم کے اندر اپنے ماضی سے نفرت پیدا ہو۔

مسلم مفکرین اور اصحاب علم میں بھی وہ لوگ ان اشتراکیوں کی ثناخوانی کے مستحق ٹھہرے جن کے افکار و نظریات میں جاہلیت کی چاشنی موجود تھی اور جنہیں کسی اعتبار سے بھی خالص اسلامی فکر کے علمبردار نہیں کہا جا سکتا۔ اس امت کے نامور ائمہ، محدثین، مفسرین جن کی کاوشوں سے اسلامی تعلیمات اپنی اصل صورت میں ہم تک پہنچتی ہیں یہ سب تو ان اشتراکیوں کی نظروں سے مستور رہے اور ان میں سے کسی ایک شخص کی پاکیزہ زندگی اور اس کی بیش قیمت علمی خدمات کے بارے میں ان لوگوں نے کبھی کوئی کلمہ خیر نہیں کہا اور اگر کسی وقت کہنے پر مجبور بھی ہوئے تو ان باتوں کا تذکرہ کیا جن میں ذم کا پہلو نکلتا تھا۔

ان اشتراکیوں کو اسلام اور اسلامی تہذیب سے جس قدر نفرت ہے وہ کسی دوسرے مذہب اور تمدن سے نہیں۔ یہ ہندومت اور بدھ مت کی بڑے جوش و خروش سے مدح و ستائش کریں گے۔ یہ ہندو تہذیب و ثقافت کی خوبیاں گنوانے میں پیش پیش ہوں گے، یہ مغربی تمدن کے اوصاف اس انداز سے بیان کریں گے کہ ان کی عظمت کا نقش خود بخود دلوں پر بیٹھتا چلا جائے اور انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ جس معاشرے پر اس تمدن کی چھاپ نہیں وہ کسی صورت میں کوئی مہذب معاشرہ کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ یہ حضرات اگر اسلامی تمدن کے کسی پہلو کی طرف متوجہ بھی ہوں گے تو ان کی توجہ کا مرکز وہ چیزیں ہوں گی جن کا دین سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں بلکہ جنہیں اُمت

کے تفقہ علماء اور فقہا نے بدعات اور غیر شرعی افعال و اعمال سے تعبیر کیا ہے - اِن اشتراکیوں نے اسلام سے اپنی محبت اور عقیدت کا جب کبھی اظہار کیا ہے تو ایسے کاموں میں دلچسپی کے ذریعے کیا ہے جن سے نظامِ شریعت سے بغاوت کا جذبہ پیدا ہو اور انسان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو کہ مذہب ایک خاص نوعیت کے ذہنی سرور کا نام ہے جس کا اس کی خارجی زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں - چنانچہ یہ حضرات قوالی اور سماع اور وجد و حال کی محفلوں میں شریک ہو کر ان کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ مسلمان ان " روحانی سرگرمیوں" کو ہی اصل دین سمجھ کر شرعی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیں - اسی طرح انہیں مزاروں پہ چادریں چڑھانے اور عرسوں کی رونق بڑھانے میں تو بڑا لطف آتا ہے لیکن ان صوفیا کی دینی خدمات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی - پھر ان بزرگوں کی اگر کوئی تحریر یا کلام محفوظ ہو تو یہ لوگ ان حصوں کو تو یکسر نظر انداز کر دیں گے جن میں احکامِ شریعت کی پابندی پر زور دیا گیا ہے اور ان حصوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے جن سے کسی طرح شریعت کے استخفاف کا کوئی پہلو نکلتا ہو اور اگر کوشش کے باوجود کوئی ایسا پہلو نظر نہ آئے تو ان کے کلام کو توڑ موڑ کر خود کوئی ایسے پہلو نکالنے میں انہیں کوئی باک نہیں ہوتا -

---

اسلامی نظامِ حیات کے احیاء کا مقصد چونکہ اسلامی نظامِ شریعت کا نفاذ ہے اس لیے مارکس اور لینن کے یہ معتقدین ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ کسی طرح شریعت کا ڈھانچہ منتشر ہو کر رہ جائے یا اگر بالکل پارہ پارہ نہ ہو تو کم از کم اس قدر کمزور ضرور ہو جائے کہ اس کے ہر حکم اور اصول کو اپنے ذوق کے مطابق موڑا جا سکے - اِس بنا پر ان لوگوں نے ایسے تمام فتنوں کی سرپرستی اپنے ذمے لے رکھی ہے جن کا مقصد نظامِ شریعت کے اندر اختلال اور بگاڑ پیدا کرنا ہے - جو لوگ اس نظام کے مزاج اور اس کی ہیئت سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں کہ احکامِ الٰہی کا اصل منشا اور مدعا اور ان کے نفاذ کے عملی طریقے اور اس کی معین صورتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہی اجاگر ہوتی ہیں - اگر حضورؐ کی سنّت ہم میں موجود نہ ہوتی تو اسلامی نظامِ حیات کا پورا نقشہ اپنے تمام عملی مضمرات اور مظاہر کے ساتھ کبھی ہمارے سامنے نہ ہوتا - یہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا فیضان بلکہ اعجاز ہے کہ مسلم قوم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی عبادات سے لے کر معیشت، معاشرت، سیاست اور قانون تک کے معاملات میں نہ صرف واضح تصورات رکھتی ہے بلکہ ان کی روح اور ان کی خارجی ہیئت سے بھی پوری (باقی بر صفحہ ۴۲)

فصل سوم

قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا تیسرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ لوگ قرآنِ مجید کو اللہ کی کتاب تسلیم کریں، اُس کی ہر بات کو حق اور من جانب اللہ مانیں، اُس میں عقائد، افکار، اخلاق، عبادات اور معاملات کے متعلق جو تعلیم بھی دی گئی ہے اُسے اپنی زندگی کے لیے اساسی قانون قرار دیں اور ہر اُس چیز کو رَد کر دیں جو اس کی ہدایت کے خلاف ہو۔ اس عقیدے میں یہ ماننا بھی لازماً شامل تھا کہ قرآن لفظ بلفظ اللہ کا کلام ہے جو بذریعۂ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف معانی آپ کے دل میں ڈالے گئے ہوں اور آپ نے اپنے الفاظ میں اُن کو ادا کر دیا ہو۔ نیز اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یہ کتاب جن الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے ٹھیک اُنہی الفاظ میں وہ جوں کی توں محفوظ کر دی گئی ہے، اس میں نہ کوئی ردّ و بدل ہوا ہے، نہ کوئی کمی یا بیشی ہوئی ہے اور نہ باطل اس میں کسی طرح راہ پا سکتا ہے۔ علاوہ بریں چونکہ یہ براہِ راست اللہ رب العالمین کا کلام ہے اس لیے یہ خود رسول پر بھی حاکم ہے۔ اگرچہ یہ آیا رسول ہی کے ذریعے سے ہے، مگر رسول اُس کا تابع ہے، اُس کے اتباع پر مامور ہے، اس کے اندر اپنی طرف سے کچھ گھٹانے یا بڑھانے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے وہ خود اس کی پیروی کرے، اور پھر اُسی کی منشا کے مطابق دین، یعنی پورے نظامِ حیات کو قائم کر دے۔

یہ عقیدہ اُس انقلاب کو اور زیادہ مستحکم کر رہا تھا جسے برپا کرنا اسلام کے پیشِ نظر تھا۔ اس لیے کہ اس نے خدا کی طرف سے ایک مستقل کتاب فراہم کر دی تھی جس میں خدا نے خود اپنے الفاظ میں صاف صاف بتا دیا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اب لوگ ہر وقت ہر زمانے میں اس کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتے ہیں کہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ایک انسان کو رسول بنانے کے ساتھ ایک کتاب بھی اس

کے ساتھ نازل کر دینا اور لوگوں کو دونوں پر ایمان لانے اور دونوں کی اطاعت کرنے کا حکم دینا، لازمی طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ انسانی افراد اور معاشروں میں جہاں بھی اس ایمان اور اس اطاعت کو قبول کر لیا جائے وہاں سے من مانی کرنے کی آزادی رخصت ہو جائے، افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اور معاشرہ اپنی اجتماعی حیثیت میں ایک رہنما اور ایک کتاب آئین کے تابع فرمان ہو جائیں، رہنما کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی کتابِ آئین ہر وقت یہ بتانے کے لیے دنیا میں موجود رہے کہ خدا نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس سے منع کیا ہے، اور رہنما کی چھوڑی ہوئی سنت، جو خود قرآن کی رو سے کلام الٰہی کی مستند سرکاری تشریح و توضیح ہے، اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دے کہ خواہشاتِ نفس کے بندے، یا دوسرے نظریاتِ زندگی کے معتقد، کتابِ آئین کو اس کے اصل معنی و مدعا سے ہٹا کر اس کی غلط تعبیریں کرنے لگیں۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے آغاز ہی میں توحید اور رسالتِ محمدیہ کے ساتھ قرآن پر ایمان لانے اور اس کو کلام الٰہی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی دعوت دینا بھی کیوں ضروری تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ جس وقت اس قرآن کو پیش کیا گیا تھا اس وقت اُس کی حیثیت کیا بیان کی گئی تھی، اور جو لوگ اس کو کتاب اللہ ماننے سے انکار کر رہے تھے اُن کے سامنے کس قدر مضبوط دلائل کے ساتھ اس کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا تھا۔

قرآن خدا کا کلام ہے جو لفظ بلفظ حضوؐر پر وحی کیا گیا ہے

یہ اوّلین بات تھی جسے پورے زور کے ساتھ قرآن میں اس قدر کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا کہ اس مضمون کی ساری آیات یہاں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پورے قرآن میں کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ شبہہ کیا جا سکتا ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ ساری کتاب اس حیثیت ہی سے پیش کی گئی ہے کہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمھاری طرف یہ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ	کتاب بھیجی ہے جو حق لے کر آئی ہے اور کتب الٰہیہ میں سے
الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ	جو کچھ اس سے پہلے آیا ہوا موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی
بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا	اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان اس
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ	چیز کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ کے نازل کی ہے اور جو حق تمھارے

مِنَ الْحَقِّ (المائدہ - ۴۸) | پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں صراحتہً نہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق ہے کر آئی ہے بلکہ دو باتیں اور بھی بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہر اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کے اندر اپنی اصلی اور صحیح صورت میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اُن کتابوں کی محافظ و نگہبان ہے۔ یعنی اس نے اُن تمام برحق تعلیمات کو اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے جو اُن میں پائی جاتی تھیں، اور جو خلافِ حق باتیں ان کے اندر شامل کر دی گئی ہیں انہیں اس کتاب کی مدد سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ (بنی اسرائیل - ۱۰۵) | اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے۔ اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہیں اس کے سوا کسی کام کے لیے رسول بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ (جو مان لے اُسے) بشارت دے دو، اور جو نہ مانے، اُسے ڈرا دو۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ (الکہف - ۲۷) | اور (اے نبیؐ) تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی گئی ہے اُسے پڑھ کر سناؤ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ، فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا، وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر - ۴۱) | (اے محمدؐ) ہم نے تم پر یہ کتاب لوگوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ اب جو ہدایت قبول کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ تم اُن کے ذمہ دار نہیں ہو۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ - ۷) | اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف عربی زبان کا قرآن وحی کیا تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (الاحقاف - ۲) | اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص - ۲۹)	یہ ایک کتاب ہے برکت والی جسے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔
وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (النمل - ۶)	اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو (یعنی اس ہستی کی طرف جو علم اور حکمت میں کامل ہے)۔
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ (الشعراء - ۱۹۲ تا ۱۹۵)	اور بلاشبہ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اسے لے کر ایک امانت دار روح تمہارے قلب پر اتری[1] ہے، تاکہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم منذرین (خلق خدا کو خبردار کرنے والے انبیاء) میں سے ہو جاؤ، صاف صاف عربی زبان میں۔
لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ (القیامہ - ۱۶ تا ۱۹)	اے نبیؐ، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کروا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

یہ آیات نہ صرف اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ پوری کتاب (قرآن) اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوئی ہے، بلکہ آخری دو آیتیں اس باب میں قطعی صریح ہیں کہ اس کے محض معانی حضورؐ پر القا نہیں ہوتے تھے جنھیں آپ اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہوں، بلکہ اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے تھے۔

---

[1] امانت دار روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جو قرآن لے کر آتے تھے۔ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے امانت دار روح کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خالص روح ہیں بلاشائبۂ مادیت، اور ایسے امین ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعے سے وحی بھیجتا ہے بالکل اسی طرح وہ بلا کم و کاست نبی تک پہنچا دیتے ہیں۔

روح الامین کا رب العالمین کی طرف سے عربی زبان میں وحی لے کر نازل ہونا، اُسے آپ کے سامنے پڑھنا، آپ کا اُسے جلدی جلدی یاد کرنے کی کوشش کرنا، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ آپ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ جب یہ پڑھا جا رہا ہو اُس وقت اسے سُنتے رہیں، پھر اسے یاد کرا دینا، اسے پڑھوا دینا اور اس کا مطلب سمجھا دینا، سب کچھ ہمارے ذمہ ہے۔ یہ ساری باتیں اسی صورت میں بامعنی ہوتی ہیں جبکہ وحی کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہوں۔ ورنہ قلبِ رسول پر محض معانی اور خیالات کا القاء ہونے کی صورت میں اس کے پڑھنے اور سُننے اور یاد کرنے اور بزبانِ عربی اس کے نازل ہونے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی قرآن کے اتباع پر مامور تھے قرآن میں اِس بات کی بھی صاف صاف صراحت کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے تابع امر تھے، اُس کی پیروی پر مامور تھے اور آپ کو اس میں کچھ گھٹانے یا بڑھانے یا کسی قسم کا ردّ و بدل کر دینے کا اختیار نہ تھا۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (الاحزاب - ۲)	اور (اے نبیؐ) پیروی کرو اُس چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے۔ جو کچھ تم لوگ کرتے ہو اللہ اس سے یقیناً باخبر ہے۔
اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ۔ (الانعام - ۱۰۶)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور مشرکین سے بے پروا ہو جاؤ۔
إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (الاحقاف - ۹)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہو) میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا کچھ نہیں ہوں۔
وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ	اور (اے نبیؐ) جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو میں تو

مِنْ رَّبِّيْ ۔ هٰذَا بَصَآئِرُ
مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔
(الاعراف ۔ ۲۰۳)

صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی جاتی ہے ۔ یہ (قرآن کی آیات) بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائیں ۔

" یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو ، یا جس چیز کی میں خود ضرورت محسوس کروں اُسے خود ایجاد یا تصنیف کرکے پیش کر دوں ۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں ۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے ۔ اِس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں اور اِس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اسے مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف نمودار ہونے لگتے ہیں ۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ
قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا
ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ
قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ
تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا
يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ
(یونس ۔ ۱۵)

اور جب اُن کو ہماری صاف صاف آیات سُنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو آخرت میں ، ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے ، کہتے ہیں کہ اِس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو ۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ، ان سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کروں ۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے ۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے ۔"

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ
لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۙ فَمَا
مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۙ
(الحاقہ ۔ ۴۴ تا ۴۷)

اور اگر یہ (نبی) خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے ، پھر تم میں سے کوئی اس میں حائل ہونے والا نہ ہوتا ۔

قرآن ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس کی ہر بات اٹل ہے	یہ بات بھی قرآن میں صاف صاف کہی گئی کہ قرآن کو لفظ بلفظ محفوظ

رکھنے کا اللہ نے خود ذمہ لیا ہے، اس کی ہر بات اٹل ہے، اس میں باطل کسی طرح سے راہ نہیں پا سکتا، اور اللہ تعالیٰ آفاق اور انفس میں مسلسل ایسی نشانیاں دکھاتا چلا جائے گا جن سے اس کا حق ہونا ثابت ہو جائے گا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر - ۹)

ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

"یعنی یہ براہِ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ کسی کے مٹائے مٹ سکے گا، نہ کسی کے دبائے دب سکے گا، نہ کسی کے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ کسی کے روکے اس کی دعوت رُک سکے گی نہ اس میں تحریف اور ردّ و بدل کا کسی کو موقع مل سکے گا۔"

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ (البروج - ۲۱ - ۲۲)

بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔

"یعنی اس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اٹل ہے، خدا کی اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ جو بات اس میں لکھ دی گئی ہے وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے، تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔"

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ، تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (حٰم السجدہ - ۴۲)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ اُس ہستی کی نازل کردہ چیز ہے جو حکمت والی ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔

"سامنے سے باطل کے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے کوئی شخص اس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آسکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مُدن کے باب میں انسان کی جو

رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے۔"

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمٓ السجدہ - ۵۳)	عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفس میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) واقعی برحق ہے۔

"اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ عنقریب اس قرآن کی دعوت دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا جائے گی اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس کی بدولت انسانی زندگی میں کیسا عظیم مذہبی و اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں آفاقِ ارض و سما اور خود انسان کے اپنے وجود کے بارے میں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا قرآن کا برحق ہونا اور زیادہ کھلتا چلا جائے گا"۔

قرآن کا انکار کفر ہے ایمان بالقرآن اسلامی دعوت کا اُتنا ہی اہم جزو ہے جتنا توحید اور رسالت پر ایمان۔ اس لیے کسی لگی لپٹی کے بغیر لوگوں کو دعوت دی گئی کہ اس کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان لاؤ، اور جو اس پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں جن لوگوں کو برسر ہدایت قرار دیا گیا ہے ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ (البقرہ - ۴)	اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو (اے نبیؐ) تم پر نازل ہوئی ہے اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔ (بنی اسرائیل - ۸۲)	ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو (اس پر) ایمان لانے والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور (ایمان نہ لانے والے) ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (العنکبوت - ۴۷)	اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔

کفار کا ردِعمل اس حیثیت سے جب قرآن کو پیش کیا گیا تو کفارِ قریش اور عام مشرکینِ عرب کے لیے اس کو ماننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول ماننے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ کیونکہ حضورؐ کو رسول مان کر وہ آپ کی اطاعت و پیروی قبول کر بھی لیتے تو وہ یہ امید کر سکتے تھے کہ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ یہ قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکیں گے۔ لیکن یہاں تو ایک کتاب بھی اس حیثیت سے پیش کی جارہی تھی کہ اس کا لفظ لفظ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس کتاب کو مسلمان حرفاً حرفاً یاد کر رہے تھے، کیونکہ نمازوں میں اس کی تلاوت لازم تھی۔ اور حضورؐ ہر وحی کے نزول کے بعد اسے لکھواتے بھی جا رہے تھے۔ اس چیز سے پیچھا چھوٹنے کی وہ کوئی امید نہ کر سکتے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اسے اللہ کا کلام مان لینے کے بعد اُن کی زندگی مستقل طور پر ایک ضابطہ میں کس دی جائے گی، جس سے انحراف کے معنی خداوند عالم سے انحراف کے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا دیا، اور ہر ممکن تدبیر اس مقصد کے لیے استعمال کر ڈالی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ہرگز نہ چلنے پائے۔

تمام کتب الٰہیہ کا انکار اس سلسلے میں ان کا سب سے پہلا حربہ یہ تھا کہ سرے سے تمام کُتُبِ الٰہیہ کا انکار کر دیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سبا - ۳۱)

اور جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن کو مانیں گے، نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو۔

لیکن اُن کی یہ بات خود اہلِ عرب میں کسی طرح نہ چل سکتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کو تو وہ خود مانتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے، چنانچہ قرآن میں دو جگہ ان کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ عرب کے نزدیک مسلّم تھے اگرچہ ان کا کوئی نسخہ ان کے پاس محفوظ نہ تھا[۵]۔ اس کے علاوہ عرب میں یہود و نصاریٰ بھی کثرت سے موجود تھے جو کتب الٰہیہ کو مانتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کفارِ عرب کو ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے اس موقف پر زیادہ اصرار نہ کیا۔

حضورؐ پر قرآن کو خود تصنیف کر لینے کا الزام پھر انہوں نے سب سے زیادہ زور اپنے اس الزام پر دیا کہ حضورؐ اس کو خود تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اس کے بڑے مفصل جوابات قرآن میں دیے گئے اور پرزور دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا کہ یہ کلام الٰہی ہے:

۵۔ یہ حوالے النجم، آیت ۳۷۔ اور الاعلیٰ آیت ۱۹ میں موجود ہیں۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (السجدہ - ۲) اس کلام کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

قرآن مجید کی متعدد سورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرہ سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغاز کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آ رہا ہے۔ یہ بظاہر اُسی طرح کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو کے اس معمولی سے اعلان کے برعکس قرآن مجید کی کسی سورت کا آغاز جب اِس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ پیغام فرمانروائے کائنات کی طرف سے آ رہا ہے تو یہ محض مصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اُس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت اِنذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ چھوٹتے ہی اتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ اس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں؟ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِاطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرہ مول لیتا ہوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالم کا کلام ہے تو اسے رد کرنے کا نتیجہ مجھ کو ابدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مجرد اپنی اِس غیر معمولی نوعیت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کلام کو سُنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اِس کو کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے، بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ بیشک یہ خدا کی کتاب ہے "اِس کے مُنَزَّل مِن اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے"۔ اِس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکہ معظمہ کے اُن باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راستباز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اس سے وہ باتیں نہ سُنی تھیں جو دعوائے نبوت کے بعد یکایک

آس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہتہً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو طرزِ بیان اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ آن کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ اُن کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ اُنہیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشاندہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف اُن کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر اُن کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جُل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا ربُّ العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ (السجدہ-۳)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اِسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبّہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پائیں۔

اُوپر کے تمہیدی فقرے کے بعد مشرکینِ مکہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کرتے تھے۔ یہ محض سوال و استفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن ساری باتوں کے باوجود، جن کی بنا پر اس کتاب کا مُنزّل من اللہ ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھرمی کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے خود تصنیف کر کے

جھوٹ موٹ اللہ رب العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سر و پا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم اِن کو نہیں آتی؟ انہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بیہودہ الزام کو سُن کر کیا رائے قائم کریں گے۔

جس طرح پہلی آیت میں لَا رَیْبَ فِیْہِ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی استدلال قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اب اِس آیت میں بھی کفارِ مکہ کے الزامِ اِفتِرا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے کہ "یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اُوپر آیت نمبر ۱ کی تشریح میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے ساتھ سب کے سامنے تھی، اور اس کے اثرات و نتائج بھی کھلے کھلے اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اس کتاب کا رب العالمین کی طرف سے آیا ہوا حق ہونا ایسا صریح امرِ واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے اُلٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اسے رات کہتے ہو؟ یہ روزِ روشن تو سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کریں گے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ (یونس - ۳۷)	اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لی جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔

"جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق ہے"، یعنی ابتدا سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں، یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انہی کی تصدیق و توثیق

کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شانِ امتیاز نمایاں کی جائے۔ "الکتاب کی تفصیل" ہے، یعنی اُن اُصولی تعلیمات کو جو تمام کُتبِ آسمانی کا لُبِّ لُباب (الکتاب) ہیں، اِس میں پھیلا کر، دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر اِنطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ	کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب
الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا	مل کر بھی اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش
الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ	کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے
كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝	کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

(بنی اسرائیل - ۸۸)

یہ چیلنج اس کے علاوہ قرآن مجید میں چار دوسرے مقامات پر بھی دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آیات ۲۳، ۲۴۔ سورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہود، آیت ۱۳۔ اور سورۂ طور، آیات ۳۳، ۳۴۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود یہ قرآن تصنیف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورۂ یونس، آیت ۱۶ میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ	یعنی "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ان سے کہو کہ اگر اللہ
عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ	نے چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں نہ سناؤں، تو میں ہرگز
فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ	نہ سنا سکتا تھا بلکہ اللہ تمہیں اِس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر
قَبْلِهٖ - اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝	میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی
	نہیں سمجھتے؟"

ان آیات میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ دراصل تین دلیلوں سے مرکّب ہے:

ایک یہ کہ قرآن اپنی زبان، اُسلوبِ بیان، طرزِ استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اَخبارِ غیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظیر لانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اسے ایک انسان نے تصنیف کیا ہے،

مگر ہم کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس شان کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جن جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرین قرآن کی مدد پر اکھٹے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پائے کی کتاب تصنیف کر کے اس چیلنج کو رد کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمہارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی چالیس سال تمہارے درمیان رہ چکے ہیں۔ کیا دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اس طرز کا کلام، اور ان مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سنا تھا؟ اگر نہیں سنا تھا اور یقیناً نہیں سنا تھا تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرز فکر و بیان میں یکایک ایسا عظیم تغیر واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمہارے درمیان ہی رہتے سہتے ہیں۔ تم ان کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سنا کرتے ہو۔ قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب بیان کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف طرز کلام کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ عربی زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا	کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ	کہو، "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس
وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ	سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو تمہارے
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۰ فَاِلَّمْ	معبود ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم
يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ	(انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود)
اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا	تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل
هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۰	ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔
(ہود، ۱۳-۱۴)	پھر کیا تم (اس امر حقیقی کے آگے) سر تسلیم خم کرتے ہو"؟

یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے، لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے) اسے خود تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر بار بار چیلنج دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ پھر جب کہ اس کتاب میں تمہارے معبودوں کی بھی کھلم کھلا مخالفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دو کیونکہ اُلوہیت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے، تو ضروری ہے کہ تمہارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھڑی میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتے اور تمہارے اندر ایسی کوئی طاقت نہیں پھونکتے کہ تم اس کتاب کی نظیر تیار کرسکو، تو اس سے صاف ثابت ہوجاتا ہے کہ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شائبۂ اُلوہیت نہیں ہے جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے مستحق ہوں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا	کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف
بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ	کرلیا ہے؟ کہو: "اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو ایک
اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ	ہی سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس ۔ ۳۸)	کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو۔"

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجازِ قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلندتر ہے کہ وہ اپنی یکتائی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کرسکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وجوہ سے ان کا من جانب اللہ ہونا یقینی ہے اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے ان کو خود

قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا	کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟
يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ	اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ
مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۚ	اپنے اِس قول میں سچے ہیں تو اِس شان کا ایک کلام
(الطور ۳۳ تا ۳۴)	بنا لائیں۔

دوسرے الفاظ میں اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود اُن کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں ہو سکتا اور دوسرے وہ لوگ بھی جو اہل زبان ہیں نہ صرف یہ کہ اسے سُن کر صاف محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ انسانی کلام سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ اُن میں سے جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے وہ کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ واقعی یہ آپ ہی کا کلام ہے۔ پس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کو آپ کی تصنیف قرار دینے والے دراصل ایمان نہیں لانا چاہتے اس لیے وہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے گھڑ رہے ہیں جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اِسے انسانی کلام کہتے ہو تو اس پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو۔ یہ چیلنج نہ صرف قریش کو، بلکہ تمام دنیا کے مُنکرین کو سب سے پہلے اِس آیت میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد تین مرتبہ مکہ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینہ منورہ میں اسے دہرایا گیا (ملاحظہ ہو سورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہود، ۱۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، ۸۸۔ سورۃ البقرہ، ۲۳)۔ مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اُس وقت ہمت کر سکا نہ اُس کے بعد آج تک کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے طرز میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہومر، رومی، شیکسپیر، گوئٹے، غالب، ٹیگور اور اقبال، سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اُتار کر انہی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ کا مطلب قرآن کے طرزِ بیان کے مطابق اس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد طرز میں مماثلت نہیں ہے،

بلکہ مراد یہ ہے کہ اس پائے اور اس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں، دُنیا کی کسی زبان میں اُن خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدمقابل قرار پا سکے جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات ملاحظہ ہوں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے۔

۱۔ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین اندازِ بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار ادا ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جوڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا مؤثر ہے کہ کوئی زبان دان آدمی اسے سُن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا، حتّٰی کہ مُنکر اور مخالف کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب عربی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی اِس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں پہنچتی۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی اِس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اِتنی طویل مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی صدیوں تک اِملا، انشا، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے۔ اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے، اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اِس شان کی ہے؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اُس قوم نے اُٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی ہوئی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ چودہ سو برس سے اس کے

اِن اثرات کا سلسلہ جاری ہے، اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۴۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبّر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقتِ نفسُ الامری کیا ہے جس پر اُس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخّص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مقام ہے اور یہ اس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس مقام اور اِس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کونسے ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی پوری تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اِس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے، اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں وہ اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اُس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اِس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اِس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اِس دُنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے، اِس تغیّر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے، دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے، اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن اُمور کی اُس سے باز پُرس ہو گی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اُس کا پُورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اُس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا

پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اُس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اُس پر عیاں ہیں، کائنات پوری کی پوری اُس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے، نوعِ انسانی کے آغاز سے اُس کے خاتمے تک ہی نہیں بلکہ خاتمے کے بعد اُس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اُس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے، اور قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بُنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جو تصوّرِ کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اُس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ اُن پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اُس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ چودہ سو برس سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اِس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴۔ یہ کتاب پُوری کی پُوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اُس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی اُن کے حالات اور اُن کی ضروریات کے مطابق اُس کے اجزا اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزا اُس مکمل کتاب کی صورت میں مرتب کر کے دُنیا کے سامنے رکھ دیے گئے جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبع زاد نہیں ہیں بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے اس پر نازل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں خود اُس رہنما

کے طبعزاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطور خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مُقنّن کی حیثیت سے، کبھی ایک قاضی اور جج کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں، ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیل اور سلسلۂ فکر کارفرما نظر آئے، اس نے اوّل روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اُسی بنیاد پر وہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جز دوسرے اجزا سے کامل مطابقت رکھتا ہو، اور اُس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اُس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلّاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اُس کی نشان دہی کی جائے۔

۵- جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوئے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف اِن کو سُنانے کے لیے نہیں آجاتا تھا اور انہیں سُنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اُس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اُسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اُس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں اُن کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی داں لوگ پڑھ کر خود با سانی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اُس کے ہم زبان لوگ اُس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اِس کتاب کی زبان اور اِس کا اُسلوب اُس رہنما کی زبان اور اُس کے اُسلوب سے بہت مختلف ہے۔ حتّٰی کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اِس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ

کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہوسکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اُسلوبوں میں کلام کرنے کا تکلّف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہوسکے کہ یہ دو الگ اُسلوب دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنّع میں کامیاب ہوجانا تو ممکن ہے۔ لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اُسلوب کچھ ہو، اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسلوب بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶- وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہوگئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اُسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عُسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی اُسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح، دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنھوں نے اُس پر ظلم توڑے تھے، اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اُس رہنما نے ان مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا، اُس میں اُن جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اُس کی زبان سے سُنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی تھا اور آج بھی خالی نظر آتا ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر قرآن میں یہ نہیں بتاسکتا کہ یہاں انسانی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

۷- جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اُس زمانے کے اہلِ عرب اور اہلِ روم و یونان و ایران تو درکنار، اس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اُس شعبۂ علم کے آخری مسائل کیا ہیں، اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اُن مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ اُن تمام علوم

کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ چودہ[۱۴] سو برس پہلے ریگستانِ عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اُس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اِعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں، لیکن صرف اِن چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا اُس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے اور اِن شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔

(باقی)

تحریک اور جمود

سید اسعد گیلانی

تحریک اور جمود دو مخالف اور متضاد کیفیات کا نام ہے۔ انہیں یکجا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن زوال وانحطاط ایک ایسا طلسمی عمل ہے جس میں ایسے تضادات پرورش پانے لگتے ہیں اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ تضادِ فکر و عمل کا شکار ہے۔

دعوائے توحید پرستی کے ساتھ بہت سی دوسری پرستشیں بھی جمع ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن مُوحّد پھر بھی فرزندِ توحید ہی رہتا ہے۔ اتباعِ رسالت کے دعوے کے ساتھ معروف کے تقاضوں کو توڑتی ہوئی بہت سی دوسری عقیدتیں اور پیرویاں بھی جمع ہوجاتی ہیں، لیکن عشقِ رسول پھر بھی اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ قرآن کے خدا کی آخری کتاب ہونے پر ایمان کے ساتھ ساتھ غیر الٰہی قوانین کی پیروی بھی بلا کراہت ہوتی رہتی ہے، لیکن حقانیتِ قرآن کے دعوے میں بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ انسانی اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کا عمل ہوتا ہے۔ ایسی معاشرتی اور اخلاقی فضا میں قول اور فعل کا تضاد انسانی سیرت و کردار کو اس قدر ناقابلِ اعتماد بنادیتا ہے کہ کسی دوستی، محبت، رفاقت، عہد و پیمان، اور ربط و تعلق پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا، اور نہ یہ وثوق باقی رہتا ہے کہ جو شخص آج بڑی بلند آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لیے اپنے دل کی لگن کا دعویٰ کر رہا ہے کل وہ اس مقصد کی راہ مارنے سے باز رہ جائے گا۔ یہ زوالِ کردار و سیرت کی المناک صورت حال ہوتی ہے اور کسی مُصلح کے لیے ایسے حالات میں اصلاح کا کام بہت کٹھن ہوجاتا ہے۔

یہ ساری فضا زوال وانحطاط کے عمل سے بنتی ہے اور اس کی موجودگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرنے والے ادارے بھی اس فضا کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب انقلابی نعرے بے جان الفاظ بن جائیں اور انقلابی پروگرام روزمرّہ کی رسم سے زیادہ وزن نہ رکھیں تو ایسے ہی حالات میں معاشرے میں زیرِ تو

دعوت کی تجدید ناگزیر ہو جاتی ہے اور فہم کو صیقل کرکے جذبہ و شوق کو جنون بنانے اور اسے نئے آہنگ سے ابھارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تحریک جمود کا شکار ہونے لگے تو اس کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ یوں تو گزرتا ہوا زمانہ بھی خود ایک بہت بڑا سبب ہے لیکن درحقیقت بنیادی سبب فہم دعوت کا ماند پڑ جانا ہے جس سے دعوت اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔ دعوت کے فہم کی کمی کے بھی بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً مطالعہ کی کمی، نئے آنے والوں کی کثرت اور ان کی نظریاتی تربیت کا ناکافی ہونا، بہت سے لوگوں کا صرف نعروں سے متاثر ہو کر آگے بڑھنا لیکن عمل و کردار میں خام ہونا اور تحریک کو عام سیاسی اور مذہبی گروہوں کے مانند ایک گروہ سمجھ بیٹھنا اور تحریک کے داعی گروہ کی کوتاہیاں وغیرہ۔ غرض کم فہمی اور جمود کے بے شمار وجوہ ہو سکتے ہیں اور سارے ہی وجوہ جزوی طور پر درست بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جب کوئی تحریک برپا ہوتی ہے تو اس کے پاس ایک زبردست طاقتور دعوت ہوتی ہے اور وہی اس کی حقیقی چھا جانے والی قوت ہوتی ہے جو بے سروسامانی میں بھی اس کا سب سے بڑا سامان ہوتی ہے۔ دعوت کسی تحریک کا سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ہتھیار ہوتا ہے جو اگر استعمال ہوتا رہے تو تحریک کی پیش قدمی مسلسل اور پیہم جاری رہتی ہے اور جمود یا پسپائی کا کوئی تصور جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

دعوت ہر دعوت اپنے اندر ایک پوشیدہ مطالبہ رکھتی ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے بے نیاز اور غیر متعلق نہ رہا جائے۔ داعی ایک مقصد لے کر اٹھتا ہے جو اپنے اندر اجتماعی تقاضے رکھتا ہے۔ داعی کا خطاب آخر پتھروں، درختوں اور دیواروں سے تو نہیں ہوتا جو نہ سمجھ سکتے ہوں اور نہ سمجھ کر حرکت کر سکتے ہوں۔ بلکہ اس کا خطاب گوشت پوست کے انسانوں سے ہوتا ہے جنھیں خدا نے فہم کے لیے دماغ، تاثر کے لیے قلب، اور حرکت و عمل کے لیے ہاتھ پاؤں دیے ہوتے ہیں اور جن کی موافقت سے تعاون اور مخالفت سے مزاحمت ظہور میں آتی ہے۔

جس طرح ہر زندگی کا پوشیدہ تقاضا موت ہے اور ہر موت کا پوشیدہ تقاضا قیامت ہے، اسی طرح ہر دعوت کا پوشیدہ تقاضا تعاون و رفاقت ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طلبِ تعاون کے ساتھ ہی مخالفت و مزاحمت اسے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ جن لوگوں کو وہ مخاطب کرتا ہے وہ دعوت کا پیغام سن کر غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، انھیں داعی کی طرف یا تو دستِ تعاون بڑھانا پڑتا ہے یا دستِ تعدّی۔ چنانچہ جب یہ دونوں قسم کے

ما فقہ ہر چہار سمت سے آگے بڑھتے ہیں تو دعوت دورِ کشمکش میں داخل ہوتی ہے اور زندگی و ترقی کی مختلف منازل طے کرنے لگتی ہے۔

دعوت کی حیثیت ایک ایسی مشین کی سی ہوتی ہے جو فائدۂ عام کی خاطر شارع عام پر نصب کی جا رہی ہو۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہر شخص کو اس بات پر مطمئن کرے کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اس مشین کو شارعِ عام پر نصب کیا جائے۔ وہ اس کے فوائد گن گن کر بتائے۔ اس کے نصب کیے جانے کے خلاف جتنے ممکن اعتراضات ہوں ان کو رفع کرے۔ اس جگہ سے جو پرانی تعمیر منہدم کرنا مقصود ہو اس کے انہدام کی اشد ضرورت اور اہمیت بیان کرے اور اس عمارت کی موجودگی کے نقصانات گنائے اور ہر شخص کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کرے کہ خلقِ خدا کا فائدہ اسی میں ہے کہ پرانی عمارت ہٹا کر وہاں نئی مشین نصب کر دی جائے۔ دعوت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی اور خلقِ خدا تک دعوت پہنچانے کے فطری کام سے پہلو تہی کر کے کوئی تحریک انحطاط و زوال اور جمود سے نہیں بچ سکتی۔ جمود کو توڑنے والی صرف ہمہ پہلو ہمہ اطراف آگے بڑھنے والی دعوت ہوتی ہے اور یہی کسی تحریک کی گاڑی کا پٹرول ہوتی ہے۔

فہم دعوتِ دین جن لوگوں کے سامنے پیش ہوتی ہے وہ لوگ پہلے پہل ہمیشہ بے توجہی سے اس نئی آواز کو سُن کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ مختلف وجوہ سے وہ متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کبھی دعوت کا انوکھا پن اور اس کا انداز انہیں متوجہ کرتا ہے۔ کبھی داعی کی شخصیت اپنی بعض خصوصیات کے سبب توجہ کی باعث بن جاتی ہے۔ کبھی اپنے نفع اور نقصان کی باتیں سُن کر خالص کاروباری وجوہ سے ان کی توجہ ادھر ہو جاتی ہے۔ کبھی اپنے پہلے عزیز اور محترم اعتقادات و نظریات پر تنقید اور محاسبہ ان میں جھنجھلاہٹ پیدا کر کے انہیں متوجہ کرتا ہے، اور کبھی بعض اہم افرادِ معاشرہ کی طرف سے تحریک کی مخالفت یا موافقت ان کی توجہ کی باعث بن جاتی ہے۔ بہر حال بتدریج لوگ متوجہ ہونے لگتے ہیں اور توجہ کے نتیجے میں انہیں دعوت اور داعی دونوں کو سمجھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ پھر جس نیت سے انہوں نے توجہ کی ہوتی ہے اسی نیت کے موافق انہیں ماحول اور اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔ اگر ان پر جھنجھلاہٹ طاری ہے اور انہوں نے مخالفت کے نقطۂ نظر سے توجہ کی ہے تو سمجھنے کے لیے انہیں عموماً ایسے ہی لوگوں سے مدد ملتی ہے جو پہلے ہی دعوت و داعی کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر توجہ موافقانہ ہے تو اسی حلقۂ اثر کے لوگوں سے ان کا تعارف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ لازم نہیں ہے کہ دعوت تک رسائی کے یہ مختلف راستے انہیں لازماً مختلف نتائج تک ہی پہنچائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے

کہ مخالف راستے سے آنے والے دعوت کے موافق، اور موافق راستے سے آنے والے دعوت کے مخالف بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کچھ تو صحتِ نظر، افتادِ طبع، اور زاویۂ نگاہ پر منحصر ہوتی ہے، اور کچھ دعوت کے ساتھ مزاجی موافقت پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" تو وہ اصول یہاں بھی کام کرتا ہے۔ لیکن فہم دل و دماغ کے اطمینان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مکّہ کے ضعفاء اور منافقین میں ایک بڑی تعداد دعوتِ اسلامی سے پوری طرح مطمئن تھی لیکن ان کے ہاتھ پاؤں اس دعوت کے ساتھ نہ چلتے تھے۔ مدینہ کے منافقین میں بھی بہت سی اقسام ایسی تھیں جو دعوتِ اسلامی کو ذہنی طور پر دُرست اور برحق سمجھنے کے باوجود منافقانہ سرگرمیوں میں منہمک رہتی تھیں۔ یہود کے بارے میں تو قرآن تک نے فتویٰ دے دیا کہ وہ حضورؐ کو یوں پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو شناخت کرتے تھے۔ انہیں حضورؐ کی نبوت و رسالت کے بارے میں سرِمُو برابر بھی شبہہ نہ تھا۔ یعنی فہمِ دعوت ان کو پوری طرح حاصل تھا۔

حقیقتاً فہم اپنی جگہ کوئی ٹھوس اور مُثبت شے نہیں ہے، عمل اسے مُثبت بناتا ہے۔ اور اگر یہ کوئی مُثبت چیز ہے تو پھر یہ بھی لازمی نہیں کہ اس کے نتائج بھی مثبت ہی ہوں۔ اس کی مثال پھر وہی ہے کہ جب ایک شخص کسی شارع عام پر افادۂ عام کی خاطر کوئی مشین نصب کرنا چاہے تو جو لوگ اس کے مقصد کو سمجھ لیں، اس مشین کی ترکیب، اس کی ہیئت اور میکانزم کو جان لیں، اس کے فوائد پر مطمئن ہو جائیں اور ذہنی طور پر انہیں وہاں اس مشین کے نصب کیے جانے پر کوئی اعتراض نہ رہے، تو گویا انہیں دعوت کا فہم حاصل ہو گیا۔ لیکن محض فہم کسی کام نہیں آتا جب تک تعاون و رفاقت کا گہرا جذبہ بھی دل میں موجزن نہ ہو اور وہ آگے بڑھ کر اسے نصب کرنے میں مدد دینے پر تیار نہ ہو جائیں۔ مدد کے لیے تیار ہو جانا اور عمل کے میدان میں اپنا وقت، قوت اور صلاحیت لے کر آگے بڑھنا ہی وہ حرکت ہے جہاں سے جمود ٹوٹتا ہے اور تحریک شروع ہوتی ہے۔ البتہ فرد کی تحریک اور اجتماع کی تحریک میں فرق ہے۔ اجتماع کی تحریک تب وجود میں آتی ہے جب فہم حاصل کرنے والے سارے افراد حرکت میں آجائیں۔

جذبہ فہم کے بعد اس کے نتیجہ میں ایک جذبہ اُبھرتا ہے۔ فہم اگر ذہن کے اطمینان کا نام ہے تو جذبہ دل کے اطمینان کا نام ہے۔ اور دل چونکہ حرکت و قلب کا منبع ہے اس لیے تعاون کی تحریک حقیقتاً یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دعوت میں داعی کی طرف سے مخاطبین کے فہم کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبے کو اُبھارنے کا سامان بھی ہوتا ہے، اور اگر کوئی فلسفیانہ قسم کی دعوت جذبہ انگیزی سے خالی ہو اور خشک

الفاظ کا جادو ہی جگائے اور اس کے پیچھے انسانی جذبات کو برانگیختہ کر کے حرکت میں لانے کی قوت نہ ہو تو اسے زیادہ معاونین میسر نہیں آتے اور نہ اُس کا معاشرے میں زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ قرآن کا انداز بیان بھی اپنی جگہ موضوعِ بیان کے برابر اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ قرآن کو تو اس بات کا دعوٰی ہے کہ کوئی اس جیسا انداز بیان لا نہیں سکتا اور یہ دعوٰی تا قیامت قائم اور لاجواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے سردارانِ قریش حضورؐ کے پاس جا کر بات چیت کرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کہیں تاثیرِ کلام سے وہ خود متاثر نہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ دوسروں کو بھی حضورؐ کے پاس جانے سے روکتے تھے کہ وہ تاثیرِ کلام اور حضورؐ کی شخصیت سے متاثر نہ ہو جائیں۔ حد یہ ہے کہ اس تاثیرِ کلام اور اثر انگیزی کا نام انہوں نے بے عقلی یا شرارت سے جادوگری اور ساحری تک رکھ چھوڑا تھا۔ آج اگر حضورؐ کے ارشادات کے مجموعے احادیث کی شکل میں اُٹھا کر دیکھیں تو وہاں ایسے ایسے الفاظ، جملے اور ادبی جواہر پارے ملتے ہیں کہ آدمی کا دل پہلو میں بار بار تڑپ اُٹھتا ہے اور زبان سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور تاثر کے سبب بار بار رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ یہ بہترین ادبی اور فکری جواہر پارے کسی ایسے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں جو حرفوں کی دنیا سے عملاً آشنا نہ تھا۔ دعوت کی حیثیت اگر مشین کی ہے اور فہم اگر اس کی افادیت اور اس کی ہیئت اور ترکیب کا شعور دلاتا ہے تو جذبہ اس کے پرزوں اور پہیوں کو حرکت میں لانے والی برقی رَو ہے جس کے بغیر مشین کام نہیں کر سکتی، نہ چل سکتی ہے، نہ نتائج دے سکتی ہے اور نہ مقصود حاصل کر سکتی ہے۔ دعوت اگر گاڑی ہے اور فہم سمتِ منزل کا تعین ہے تو جذبہ اس گاڑی کی قوتِ محرکہ ہے جس کے ذریعے کارواں منزل کی طرف جادہ پیماں ہوتا ہے اور اس جذبے کے قائم رہنے سے اس سمتِ منزل میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

کسی داعی کو اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے اُبھارنے اُکسانے یا ترغیب دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ جب اپنے اندر کوئی پیغام اُبھرتا ہوا محسوس کرتا ہے تو جس طرح پھوٹنے والا بیج زمین کے سات پردے چاک کر کے بھی فضائے آزاد میں کونپل کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے اسی طرح داعی کے اندر اس کا پیغام اس کے جذبۂ صادق کی مدد سے از خود باہر پھوٹ نکلتا ہے۔ پھر فہم و شعور کے لیے اس کی دعوت کو غور و توجہ سے سُننے کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ دعوت تحریری صورت میں ہے تو ان تحریروں کو نہایت غور و فکر سے پڑھا جائے اور ساتھ ساتھ داعی کے کردار کو بھی دیکھا جائے اور اگر دعوت زبانی ہے تو اس کی گفتگو کو سُنا جائے۔ تحریر ہو یا تقریر، دونوں کے ذریعے داعی مخاطب کے اندر فہم و جذبہ دونوں بیک وقت اتارنے کی کوشش کرتا ہے در

ان دونوں کی مدد سے وہ مخاطب کو اپنی حمایت واعانت پر آمادہ کرتا ہے۔

فہم حاصل ہونے کے بعد عموماً کبھی کم نہیں ہوتا اور نہ ضائع ہوتا ہے۔ کسی مرحلے پر غلط فہمی ہوسکتی ہے، لیکن وہ عارضی ہوتی ہے۔ فہم و شعور تلف ہونے یا ضائع ہونے، دھندلانے یا سرد پڑنے کی چیز نہیں ہیں۔ جس طرح ایک شخص جب ایک مشین کی ہیئتِ ترکیبی اور فوائد سے آگاہ ہوجاتا ہے تو پھر اس سے اس کی یہ سمجھ چھن نہیں جاتی اور نہ اس کا یہ شعور ہی ماند پڑتا ہے۔ البتہ ایک چیز جو کسی وقت بھی مختلف اسباب سے کم و بیش ہوسکتی ہے وہ جذبہ ہے، یعنی وہ برقی رَو جو مشین کو حرکت میں لاتی ہے۔ اسی جذبے کی کمی فساد کی مختلف صورتیں پیدا کرتی ہے۔

جذبہ عمر کے تقاضوں سے بھی کم و بیش ہوتا ہے، یہ دُنیوی مصروفیات سے بھی متاثر ہوتا ہے، یہ کاروباری اغراض سے بھی اثر لیتا ہے، یہ دعوت کے مختلف مراحل میں مشکلات و مصائب کے سامنے آنے سے یا تصور سے بھی کم و بیش ہوتا ہے۔ اس پر بیوی بچے والدین دوست احباب اور مال و دولت بھی ڈاکے ڈال دیتے ہیں، حتیٰ کہ یہ داعی سے معمولی بدگمانی سے بھی کم ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ شخصی رابطہ کم ہوجانے سے بھی گھٹ جاتا ہے۔ یہ بڑی ہی نازک چیز ہے۔ جس طرح ہر وقت ایک انسان کی داخلی کیفیت یکساں نہیں رہتی اسی طرح اس جذبے کی کیفیت بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ یہی وہ چیز تھی جسے صحابہ کرامؓ حضوؐر اکرم کی مجلس میں مختلف اور اپنے گھروں میں اپنے اندر مختلف پاکر تشویش محسوس کیا کرتے تھے۔

اس قیمتی متاع کو اپنے اندر قائم رکھنا ہر مسافرِ راہِ حق کا اوّلین فرض ہے۔ تلاوتِ قرآن اور مطالعہ حدیث سے انسان کی داخلی کیفیات میں جو نمایاں فرق ہوتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ صاحبِ کلام سے ذہنی اور قلبی قرب حاصل ہوجاتا ہے ورنہ شعوری طور پر تو ایک بے عمل مسلمان بھی اقرار کرتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حضوؐر اللہ کے سچے پیغمبر تھے۔ اسی طرح دوسری تحریریں جو اس دعوت کو اجاگر کرنے والی اور اس کام کی انجام دہی کے لیے بلانے والی ہوں۔ ان کا مطالعہ اور پیہم مطالعہ بھی جذبہ انگیزی اور قوت و حرکت یعنی دل کی بیداری کے لیے اشد ضروری ہے۔ جس لٹریچر نے آپ کو ایک مقصدِ زندگی کا شعور دیا ہو، اس مقصد سے آشنا کیا ہو، اس مقصد کے لیے ایثار و قربانی پر آمادہ کیا ہو اور آپ سے بے شمار قربانیاں اللہ کی راہ میں کروائی ہوں، آپ کو ایک طویل عرصے تک خدا کی راہ میں پیہم سرگرم و متحرک رکھا ہو، آپ سے ایک نوعیت کی مصروفیات چھڑائی ہوں اور دوسری نوعیت کی مصروفیات میں لا ڈالا ہو، آپ کا حلقۂ احباب، آپ کا ذوق و شوق، آپ کا

لباس، آپ کا طرزِ فکر، آپ کی نشست و برخاست اور آپ کی زندگی کا تمام رُخ بدل دیا ہو، کیا اسے پڑھنے اور نہ پڑھنے میں کوئی فرق نہیں ہے؟ کیا اس کا مطالعہ چھوٹ جانے سے کوئی کمی واقع نہ ہوگی؟ کیا اس کی اشاعت ختم ہو جانے سے آپ کے حلقۂ اثر میں کوئی فرق نہ آئے گا؟ اس کی کمی سے آپ کی زندگی میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی؟ کیا اس سے رشتہ ٹوٹنے سے آپ اسی گڑھے میں عملی طور پر نہ جا گریں گے جس سے آپ کو اس نے نکالا تھا اور جس سے نکل کر آپ بہت خوش اور مطمئن تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ کوئی انقلاب برپا کرنے کے لیے اس کی دعوت ضروری ہے اور دعوت کے لیے فہم بھی بلاشبہ اشد ضروری ہے، لیکن فہم کے باوجود جذبے کی کمی کے سبب آدمی نفاق و ضعف میں مبتلا ہو سکتا ہے جس سینے میں ایثار و قربانی کا گہرا جذبہ موجود ہو وہاں اخلاص کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ اخلاص تبھی حاصل ہوتا اور قائم رہتا ہے اگر آدمی دعوت کے فہم کو تازہ رکھے اور مقصد کے حصول کی سمت میں برابر اور پیہم اقدامات کرتا رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تحریک میں جمود کے دیگر عوامل پر بھی بحث کی ضرورت ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس کے ضروری پہلوؤں پر آئندہ کسی مضمون میں روشنی ڈالوں۔

رسائل و مسائل

وجودِ باری اور مذہبی تعلیمات سے متعلق چند اشکالات

ــــــ ملک غلام علی ــــــ

سوال:- میں سائنس کا طالب علم ہوں اور زندگی کے ایسے دور سے گزر رہا ہوں جس میں ذہن پہ جو نقوش بھی مرتسم ہو جائیں وہ ہمیشہ کے لیے راحت یا ذہنی اذیت کا موجب بن جاتے ہیں۔ میں بڑا مذہبی قسم کا نوجوان تھا مگر اب میرے دل میں یقین کے بجائے شکوک پیدا ہونے لگے ہیں۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں مگر رسمی طور پر۔ میرے دل میں جو خیالات آتے ہیں انہیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

خدا کے وجود کو سائنس کے اُصولوں کی رُو سے کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ابتدائی زمانے کے لوگوں نے یہ تصور ایجاد کر لیا ہو اور پھر یہ برابر ہم تک منتقل ہوتا چلا آیا ہو۔ اس وقت انسان قوانینِ فطرت اور مظاہرِ کائنات کی حقیقت سے بے خبر تھا مگر آج وہ کائنات کے رازوں سے آشنا ہو چکا ہے۔ اور اعتقادِ باری کی ضرورت بعض کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اللہ کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی مذہب کی بعض تعلیمات ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہی بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی تھا۔ مگر کائنات میں کششِ ثقل اور دوسرے خلائی قوانین کارفرما ہیں ان کی موجودگی میں یہ واقعہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہی مشکل دوسرے معجزات کے بارے میں ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کو توڑے بغیر صادر نہیں ہو سکتے اور اللہ اپنے قانون اور سنت کو نہیں بدلتا۔ چاند اگر دو ٹکڑے ہو تو کیا زمین تباہ ہونے سے محفوظ رہ سکتی ہے؟

جواب: (۱) آپ کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہو رہے ہیں ان کا پیدا ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ ہر سوچنے والے دماغ کے اندر اس طرح کے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک انسان کی خیریت اور نجات

اس بات میں ہے کہ وہ ان سوالات کا ایسا جواب تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے جو اس کی بے لگام خواہشِ نفس کے مطابق ہو اور جو اسے نباتات وجمادات یا حیوانات کی طرح اخلاقی احساس اور ذمہ داری سے بالکل خالی اور عاری بناتا ہو۔ دنیا میں بیشتر لوگ جنہوں نے اللہ کے وجود سے انکار کیا ہے ایسے ہیں کہ وہ محض اس وجہ سے منکرِ خدا بن جاتے ہیں کہ اگر وہ خدا کو تسلیم کریں تو انہیں اپنی زندگی بعض حدود وقیود کی پابندی کے ساتھ بسر کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ آپ غور کریں کہ ایک سائنس دان کے پاس انکارِ خدا کے حق میں کیا دلیل یا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سائنس محض اس دنیا سے بحث کرتی ہے جو مادے اور توانائی پر مشتمل ہے لیکن سائنس خود تسلیم کرتی ہے کہ یہ مادی کائنات نہ ہمیشہ سے موجود ہے، نہ اپنے آپ سے وجود میں آئی ہے۔ نہ یہ ہمیشہ قائم رہ سکتی ہے۔ خود کائنات کے اندر جن اشیاء میں زندگی اور شعور پایا جاتا ہے کوئی سائنس دان نہ ان میں زندگی کو خود وجود میں لا سکتا ہے نہ وہ یہی بتا سکتا ہے کہ بے جان مادے کے اندر جان کیسے پیدا ہوتی ہے اور کیسے ختم ہوتی ہے۔ اس کائنات کی کوئی حد، کوئی اس کا اوّلین و آخرین سرا ایسا نہیں جو انسان کی گرفت میں آسکے۔ اس کے بعد آخر کائنات کے معمے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ اس کا کوئی خالق اور بنانے والا ایسا تسلیم کیا جائے جو اس کائنات سے بلند و بالا اور اس سے ماوراء ہے، اس حد تک اور اس معنی میں اللہ کے وجود کو ہر قابلِ ذکر سائنس دان اور فلسفی تسلیم کرتا ہے اور خدا کے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ چند سال قبل امریکہ میں ایک کتاب (EVIDENCE OF GOD) شائع ہوئی ہے جس میں دنیا کے چالیس نامور ترین سائنس دانوں کے الگ الگ مضامین شامل ہیں جن میں سے ہر ایک نے اللہ کے وجود کو مانا ہے اور اس کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ اس کا ترجمہ مکتبہ فرینکلن لاہور نے اُردو میں شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "خدا موجود ہے"۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر اللہ ہے تو اُس کی ذات و صفات کا تصور کیا ہے اور وہ انسان سے کیا چاہتا ہے، اس کی مرضی کیا ہے، ان سوالات کا صحیح جواب کوئی سائنس دان یا غیر سائنس دان اپنی عقل و منطق کے بل بوتے پر نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب اللہ کے نبی اور رسول ہی دے سکتے ہیں جن کی صداقت پر ان کی سیرت و اخلاق گواہ ہے۔

(۲) یہ بات کہ مذہب اور خدا انسانی ذہن کی پیداوار ہے، اگرچہ بجائے خود صحیح نہیں لیکن جو بات بھی انسان کے ذہن میں پیدا ہو جائے کیا اس کا پیدا ہونا اس امر کا کافی ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس شے کا خارج میں وجود نہیں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کی ذات بجائے خود ایک حقیقت ہو اور اسی کا پتہ تو انسان

کے ذہن پر پڑتا ہو۔ انسانی ذہن میں ہمیشہ سے خدا کے تصور کی موجودگی سے آخر خدا کا عدم وجود کیسے ثابت ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس یہ تو خالقِ کائنات کے وجود کی ایک دلیل ہے۔ یہ استدلال بھی بالکل غلط ہے کہ پہلے قوانین فطرت انسان کو معلوم نہ تھے اس لیے وہ خدا کا قائل ہوگیا۔ کیا فطرت اور قوانین فطرت سے متعلق سارے بھید اور ساری تفصیلات انسان کو اب معلوم ہوگئی ہیں یا کبھی ہوسکتی ہیں؟ کیا آپ مجھے صرف اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ اجرام فلکی سے بھری ہوئی اس کائنات کی انتہا کہاں تک ہے اور اس انتہا سے آگے کیا ہے؟ فرض کیا کہ آپ کو تمام قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) معلوم ہوگئے ہیں تب بھی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس اندھی بہری کائنات میں یہ قوانین کس نے بنائے ہیں اور کس نے ان عناصر کائنات کو پابندِ قانون اور مسخر بنا رکھا ہے؟

(۳) معراج شریف کے روحانی یا جسمانی ہونے کے متعلق اگرچہ سلف میں کچھ اختلاف ہوا ہے، لیکن ہمارے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ یہ روح و جسم دونوں کے ساتھ تھا۔ معراج، شق القمر اور اس طرح کے دوسرے معجزات کے متعلق سارے اعتراضات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ انسان اپنی تنگ کھوپڑی سے ہر مسئلے کو دیکھتا اور اس پر سوچتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح یہ کائنات بعض قوانین کی پابند ہے اسی طرح اس کائنات کا بنانے والا بھی ان قوانین کا مطیع اور غلام ہے اور اپنے بنائے ہوئے قوانین میں وہ خود بھی جکڑا جا چکا ہے حالانکہ یہ تصور بنیادی طور پر غلط اور باطل ہے۔ اللہ جب چاہے اپنے قانون میں تبدیلی کر سکتا ہے اور یہ تبدیلی بھی اس کے قانون ہی کے تحت ہوگی۔ مثال کے طور پر اللہ اس وقت انسان کو نر اور مادے کے اتصال سے پیدا کرتا ہے لیکن نر اور مادے کا یہ اتصال پیدائش کے ابدی اور ازلی اصول نہیں ہوسکتا۔ اللہ چاہے تو اس کے بغیر انسان پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ چاہے تو کششِ ثقل کے قانون کو معطل کر سکتا ہے اور اپنے بندے کو کائنات کے کسی ایسے مقام تک لے جا سکتا ہے جہاں اس کی تجلیات مرتکز اور متمکن ہیں۔ اللہ چاہے تو چاند کے تھوڑی دیر کے لیے دو ٹکڑے کر سکتا ہے اور زمین اور دوسرے اجرام فلکی کو اس کے اثرات سے محفوظ کر سکتا ہے۔ بلاشبہ اللہ اپنی سنت اور اپنے کلمات میں تبدیلی نہیں فرماتا۔ لیکن ہمیں کیا معلوم کہ اللہ کی سنت کیا ہے اور اس کی باتیں (کلمات) کیا کیا ہیں۔ اللہ جس کو اپنی سنت سمجھتا ہے اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن جسے ہم اپنے طور پر اللہ کی سنت سمجھ بیٹھیں اس میں ہر وقت تبدیلی ممکن ہے۔ مثلاً ایک شخص

اللہ کی سنت یہ قرار دیتا ہے کہ سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع ہو یا طلوع ہوتا دکھائی دے لیکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کی سنت یہ بھی ہو کہ ایک دن اُس کی گردش اُلٹ دی جاتے یا اسے ختم ہی کر دیا جائے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں سنت اللہ سے مراد بالعموم طبعی قوانین نہیں بلکہ وہ اخلاقی و معنوی قوانین ہیں جو اقوام عالم اور تہذیب انسانی کے عروج و زوال یا نشوو ارتقاء سے متعلق ہیں اور وہ بھی کوئی ایک ہی لگا بندھا قانون نہیں بلکہ ایک نہایت وسیع، حکیمانہ اور مربوط سلسلۂ قوانین ہے جو حیات انسانی کے مختلف گوشوں میں جاری وساری ہے۔

(بقیہ مطبوعات صفحہ ۸۴ سے آگے)

کے نشیب و فراز طے کیے۔ اُردو ادب میں بکثرت ایسا مواد ملتا ہے جس سے ہمارے قریب کے دور کے شرفا کی عائلی زندگی کا اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ہمارے اس ادبی ورثہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اس میں اُن ساری اقدار کی عکاسی کی گئی ہے جو کبھی ہماری معاشرتی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ تھیں اور جن کی وجہ سے ہمارے گھر جنت ارضی کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ، دوسرے کے جذبات کا احساس اور اُن کے مراتب کا پاس ہماری معاشرتی زندگی کے رہنما اُصول تھے۔ یہ کتاب اُن اُصولوں کے متعدد عملی مظاہر پیش کرتی ہے۔ فاضل مصنّف جو اُردو کے منجھے ہوئے اور کہنہ مشق ادیب ہیں، انہوں نے ان مظاہر کو اس حکیمانہ انداز میں تحریر کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ کہیں بھی تعلی کا رنگ نمایاں نہیں ہونے پاتا۔ زبان دلکش اور اسلوبِ نگارش دلچسپ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ذہن کو آسودگی حاصل ہوتی ہے وہاں ریاست حیدرآباد دکن کے بہت سے انتظامی اور سیاسی معاملات بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) طرح واقف ہے۔ اشتراکیت کے پرستار دیگر اسلام دشمن طاقتوں کی طرح سنت کی اس حیثیت کو ختم کرنے کے ہمیشہ درپے رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ہر اُس فرد یا گروہ کی حمایت پہ کمربستہ نظر آتے ہیں جو دین کی اس اساس کو منہدم کرنے میں مصروف ہو۔ ان گم کردہ راہ لوگوں کی ساری ہمدردیاں دین کے اندر فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے ساتھ ہوں گی اور یہ ہر مرحلہ پہ اس بات کے آرزومند دکھائی دیں گے کہ کس طرح دین کے بارے میں گمراہ کن خیالات اور معتقدات ملت کے اندر سرایت کر سکیں۔

نظامِ شریعت کے اندر نقب زنی اشتراکیوں کا بڑا دلپسند مشغلہ ہے اس مقصد کی خاطر وہ ان تمام مقامات سے نقب لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے اس نظام میں شگاف پڑ سکیں۔ ان لوگوں نے اپنے لیے جو اہم مقامات منتخب کیے ہیں اُن میں ایک نہایت ہی نازک مقام اخلاقی اقدار کا ہے۔ اسلام کے مزاج اور اس کے نظام شریعت پر غور کرنے سے یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ اس نظام میں اخلاقی اقدار کا وجود ان کے لیے غیر معمولی جذبہ احترام اور اُن کی پابندی کے لیے شدید آرزو ہی اسے دنیا میں کوئی موثر قوت بنا سکتی ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے اگر ان اقدار کی عزت و تکریم ختم ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو ان کا پابند بنانے کے بجائے اُن کی تضحیک و تذلیل کرنے لگیں یا ان کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں تو پھر اسلامی نظام کا قیام تو بڑی بات ہے اس کا تصور بھی دیوانے کے خواب سے زیادہ کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ جب لوگ اسلامی شریعت کے اوامر و نواہی ہی سے بے نیاز ہو جائیں تو وہ آخر کس بنیاد پر مسلمان رہ سکیں گے۔ اسلام میں اخلاقی اقدار کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اشتراکی اس پہ ہمیشہ تابڑ توڑ حملے کرتے رہتے ہیں اور یہ حملے فکر، میدان میں بھی کیے جاتے ہیں اور میدانِ عمل میں بھی۔ فکری اعتبار سے نوجوانوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں ہوتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کا کوئی نظام اپنی کوئی مستقل بنیاد نہیں رکھتا بلکہ وقت کے ساتھ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ اخلاقی قدریں سراسر اضافی چیزیں ہیں۔ کل جو بات برحق تھی وہ ضروری نہیں کہ آج بھی صحیح اور درست ہو اور آج جو چیز صحیح ہے وہ کل غلط ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر شرم و حیا، عفت، پاکدامنی، شرافت اور پاکیزگی کے پیمانے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اور یہ کوئی دانشمندی نہیں کہ ماضی کی اخلاقی قدروں کو ہم زبردستی اپنے ساتھ چپکائے رکھیں۔ ہر دور کا اپنا الگ قرآن ہوتا ہے۔

اخلاقی اقدار کے بارے میں مسلمانوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو بدلنے کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے

علمبردار اس بات کے لیے بھی ہمیشہ سرگرم عمل رہے ہیں کہ مسلم معاشرے میں کوئی اخلاقی حس باقی نہ رہے۔ مخلوط مجالس آراستہ کرکے، مخلوط تعلیم کو فروغ دے کر اور کلچر اور ثقافت کے نام پر رقص و سرود کی محفلیں سجا کر یہ لوگ مسلمانوں کے اخلاقی احساسات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے رہتے ہیں خصوصاً نوجوان نسل پہ ان حضرات کی خصوصی توجہ ہوتی ہے کیونکہ یہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں کہ کوئی آبرو باختہ شخص خواہ وہ کتنا ہی ذہین و فطین اور صاحب صلاحیت ہو وہ اسلام کے کسی کام کا نہیں ہوسکتا بلکہ مسلم معاشرے میں اس کا وجود اس معاشرے کے لیے ایک خطرناک روگ ہوتا ہے۔

سرخ سپاہ کی ثقافتی یلغار کا یہ پہلو بھی بڑا قابلِ غور ہے کہ مغربی ممالک یا ایسے مشرقی ممالک جن پر مغربی تہذیب کا تسلط پوری طرح قائم ہوچکا ہے، وہاں اس سپاہ نے اشتراکیت کو ایک غالب قوت بنانے کے لیے ثقافتی میدان میں ہمت آزمائی کرنے کے بجائے سیاسی اور معاشی میدانوں میں غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈبونے کے لیے طبقاتی آویزش کی آبدوز ہی زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن مسلم معاشرے کی ناؤ چونکہ اوامر و نواہی کے مضبوط تختوں سے تیار ہوئی ہے اس لیے اسے اخلاقی بے راہ روی کے طوفانوں کی زد میں لاکر غرقاب کیا جاتا ہے۔ اس بنا پہ اشتراکی علاقائی ثقافت کا غلغلہ جس انداز سے کسی مسلم معاشرے میں بلند کرتے ہیں اس کا شور کسی غیر مسلم معاشرے میں سنائی نہیں دیتا اور اس سے یہ لوگ دو طرح کے فائدے اُٹھاتے ہیں۔ ایک تو نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرکے مسلم معاشرے کی اس اساس کے نیچے بارودی سرنگیں بچھاتے ہیں جس پہ کہ یہ معاشرہ قائم ہوسکتا ہے یا قائم رہ سکتا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کو ثقافت کے چکر میں ڈال کر ان اختلافات کو اُبھارنے میں کامیاب ہوتے ہیں جن کے مظاہر کسی ملک کی معاشرت کے مختلف حصوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کی نگاہیں کبھی اس مشترک اساس پہ نہیں پڑتیں جس پر ایک معاشرہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات ختم کرکے اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کرتا ہے بلکہ ان کی ساری توجہ مسلم معاشرے کے اِن خارجی احوال کے اختلاف پہ مرکوز رہتی ہے جن کی حقیقت بالکل سطحی ہوتی ہے۔ یہ اِن سطحی اختلافات کو جو چند عارضی اور اتفاقی حادثات کی پیداوار ہوتے ہیں، کو خوب اچھالتے ہیں اور اس طرح اشتراک کی اُن مضبوط بنیادوں کو مسمار کرتے ہیں جو مسلم قوم کے لیے عقیدے اور اخلاق کے مسالے سے چنی گئی ہیں۔

اشتراکیوں کی یہ فریب کاریاں سیاسی میدان میں بھی کچھ کم تباہ کن نہیں ہوتیں۔ حکومت کے اندر گھس کر یہ لوگ جو "خدماتِ جلیلہ" سرانجام دیتے ہیں ان سے شاید ہی پاکستان کا کوئی شخص ناواقف ہو۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے آج تک جو شخص بھی اقتدار کے تخت پر متمکن ہوا ہے اس کا ذہن کم وبیش آمرانہ رہا ہے اور آمرانہ ذہن کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ خوشامد کو بہت زیادہ پسند کرتا ہے بلکہ بعض اہلِ علم نے تو چاپلوسی کو آمریت کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور مرغوب غذا کہا ہے۔ اشتراکی ہمارے ملک کے سربراہوں کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ وہ تختِ اقتدار پر قابض سب سے زیادہ مضبوط شخصیت کے اردگرد اپنا ایک مضبوط حلقہ بنا کر اسے ہر وقت یہی باور کراتے رہتے ہیں کہ حضور کا اقبال روز بروز ترقی کر رہا ہے، حضور کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، حضور کی شہرت کو چار چاند لگ رہے ہیں، حضور پر یہاں کے عوام جانیں نثار کرنے کے لیے سخت بیتاب نظر آتے ہیں۔ حضور کو اپنی غیر معمولی عقیدت کا یقین دلا کر وہ اسے بڑی خطرناک راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ جی حضوریوں کے نرغے میں گھرے ہوئے یہ حکمران زعمِ باطل میں گرفتار ہو کر اور ہر قسم کے مخلصانہ مشوروں سے بے نیاز ہو کر نہایت ہی غلط کام کرنے شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح عوام میں اُن کے خلاف نفرت و حقارت کا شدید جذبہ اُبھرنے لگتا ہے مگر ان حاشیہ نشینوں کا کمال ملاحظہ ہو کہ وہ انہیں اصل صورتِ حال سے کبھی آگاہ نہیں ہونے دیتے بلکہ جو فرد یا گروہ ملک اور قوم کی بھلائی کی خاطر حق و صداقت کی بات کرتا ہے اس کے بارے میں وہ صاحبِ اقتدار کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہی درحقیقت آپ کی اقبال مندی کا دشمن ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرمانروا عوام سے اور ملک کے باضمیر اور صاحبِ کردار لوگوں سے بالکل کٹ کر کاسہ لیسوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں اور یہ چالاک عناصر ان کی اس بے بسی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ملک کے حقیقی خیر خواہوں سے حکمرانوں کا مسلسل تصادم ہوتا رہے جس کے نتیجے میں ایک طرف تو حکمران ذلیل وخوار ہوں اور دوسری طرف قوم کے اچھے عناصر کی قوت زائل ہوتی رہے اور اس سر پھٹول میں انہیں اشتراکیت کی راہ ہموار کرنے کے لیے زرّیں مواقع فراہم ہوتے رہیں۔

حکومت کے دائرے سے ہٹ کر جب ہم ان اشتراکیوں کو سیاست کے عام میدان میں کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہاں بھی بجز اُن کی چالبازیوں کے کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ اپنی الگ جتھہ بندی کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں اور دوسری سیاسی پارٹیوں میں نفوذ کر کے انہیں اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتے ہیں یہ بیک وقت

حکمران جماعت پر اور سب سے مضبوط حزبِ اختلاف پر جس کے برسراقتدار آنے کے امکانات سب سے زیادہ روشن ہوں، اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے تگ ودو کرتے رہتے ہیں تاکہ حکومت کے ہاتھوں کی تبدیلی سے ان کے اثر و رسوخ میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ چونکہ یہ لوگ پراپیگنڈے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ ہر تحریک کے شعبہ نشر و اشاعت اور شعبہ رابطہ عوام اور مالیات پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس کے وسائل اور اثر و رسوخ کو اشتراکیت کی ترقی کے لیے پوری قوت اور ہنرمندی کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اشتراکی ہتھکنڈوں کا وقت نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ ان کی جدوجہد کے بارے میں ایک بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ یہ لوگ نہ تو کھل کر اشتراکیت کے لیے کام کرتے ہیں اور نہ براہ راست اپنے نصب العین کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ پس پردہ رہ کر اور مختلف لبادے اوڑھ کر تار ہلاتے ہیں اور چور دروازوں سے گھس کر اشتراکیت کو قوت و طاقت بہم پہنچاتے ہیں۔ یوں تو ان کی تعداد ہر جگہ عام آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہوتی ہے لیکن مسلم معاشرے میں تو ان کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوتا۔ مگر یہ لوگ محض اپنی چالاکیوں اور عیاریوں اور پراپیگنڈے کے فن میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے عوام و خواص کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ کسی ملک اور قوم کی سب سے بڑی اور فیصلہ کن قوت ہیں اور جن جماعتوں یا گروہوں نے انہیں نظرانداز کر کے کوئی قدم اُٹھانے کی کوشش کی وہ زندگی کے ہر میدان میں ناکام و نامراد رہیں گے۔ اُن کی رائے کے بغیر اور ان کی تائید و حمایت سے صرفِ نظر کر کے کوئی تحریک ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ ملک اور قوم کا مستقبل بلا شرکت غیرے انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے وہی در حقیقت ملک و ملت کا مقدر ہوگا۔

مطبوعات

اقبال اور قادیانی تالیف : نعیم آسی صاحب۔

شائع کردہ : مسلم اکادمی سیالکوٹ۔

قیمت : ۹/- روپے - صفحات : ۱۸۸

قادیانیت کوئی دینی تحریک نہیں بلکہ اسلام اور ختم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک سازش ہے جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اسلام میں جو مرکزی حیثیت سرور دو عالم کو حاصل ہے اور جس کی وجہ سے وہ تمام مسلمانوں کے ہادی، مطاع اور ان کی محبت و عقیدت کے واحد مرکز و محور ہیں، اسے ختم کر کے مرزا غلام احمد قادیانی کو اُس مقام پر فائز کر دیا جائے۔ یہ انگریزی استعمار کی بنیادی ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں کسی نہایت قابلِ اعتماد اور وفادار شخص کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ وہ مذہب کی آڑ میں مسلم عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل کر انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں مدد دے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ شخص اس فرض کو اسی صورت میں بخوبی سرانجام دے سکتا تھا جب وہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کے محور کو بدل دے۔ اس مقصد کی تکمیل جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچائے بغیر ممکن نہ تھی چنانچہ مرزا صاحب کو نبوت کے دعویدار کی حیثیت سے انگریز کی چاکری کا فرض انجام دینا پڑا۔ انہوں نے ایک نہایت چالاک دشمن کی طرح اُمتِ مسلمہ پر شبخون مارا۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر اور اپنے آپ کو خادمِ اسلام ثابت کرنے کی غرض سے پہلے غیر مسلموں سے مناظرے کیے اور جب اس مناظرہ بازی کی وجہ سے کچھ قدم جم گئے تو پھر بڑی عیاری کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کر دیا اور جو لوگ ان کے اس دعوے کو مان کر ان کے ساتھ شامل ہوئے انہیں برطانوی استعمار کی گاڑی میں جوت دیا۔

قادیانیت کے رد میں یوں تو متعدد کتب لکھی جا چکی ہیں لیکن جس بے نظیر منطقی استدلال اور زورِ بیان کے ساتھ علامہ اقبالؒ نے اس کا رد کیا ہے وہ اِسی نامور مفکر ہی کا حصہ ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کو اس دامِ ہمرنگ زمین سے بچانے کے لیے اس مردِ حق آگاہ نے بیش قیمت خدمت سرانجام دی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کی تصریحات کا مرقع ہے۔ ایسے صاحبِ ذوق مؤلف نے بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ جمع کیا ہے اور ضروری مقامات پہ نہایت قابلِ قدر اضافے بھی شامل کر دیے ہیں۔ اس تالیف میں چند چیزیں بڑی معلومات افزا ہیں۔ مثلاً انگریز حکام کے نام مرزا صاحب کے خطوط کے عکس جن میں انہیں اپنی اور اپنے خاندان کی وفاداری کا یقین دلایا گیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے اس افسوسناک ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کے تحت مرزا صاحب نے انگریز کی غلامی اختیار کی۔ فاضل مرتب نے مرزائیت کے متعلق علامہ اقبالؒ کی ابتدائی زندگی کی چند آرا کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر اُن کی اصل حقیقت بھی شرح و بسط سے بیان کر دی ہے تاکہ قادیانیوں کو علامہ اقبال کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرنے کا موقع حاصل نہ ہو سکے۔

ہم اسی ضمن میں فاضل مصنف سے یہ گذارش کریں گے کہ تبصرہ نگار کو نہایت ہی قابلِ وثوق ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ علامہ صاحب کا اصل انگریزی خطبہ جو اردو میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے شائع ہوا ہے اور جس میں مرزائیت کے بارے میں چند تعریفی کلمات موجود ہیں وہ ان کے خاندان کے کسی فرد کے پاس موجود ہے اور اس میں خود علامہ صاحب نے اپنے ان کلمات پر حاشیے لکھے ہیں اگر وہ خطبہ فراہم ہو سکے تو اُسے مع علامہ صاحب کی اپنی توضیحات کے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیا جائے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

انسان کامل

تالیف : جناب خالد علوی صاحب

شائع کردہ : یونیورسٹی بک ایجنسی - ۱۹۴ - انار کلی لاہور

قیمت : -/۳۶ روپے صفحات : ۶۷۶

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک تابدار ہیرے کی مانند ہے جو اپنے لاتعداد پہلو رکھتی ہے اور اُن میں سے ہر پہلو اتنا پرکشش اور جاذب نظر ہے کہ انسان کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول ہو ہی نہیں سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پہ بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کتاب کو بھی جامع نہیں کہا جاسکتا اور حقیقت میں اس موضوع پہ کوئی جامع تصنیف تیار بھی نہیں کی جا سکتی۔ سیرت کا ہر جوہری جواہرات کی وسیع و عمیق کان میں سے اپنی ہمت اور ذوق کے مطابق ایک آدھ گوہر تلاش کرنے

کو ہی بڑی کامرانی تصور کرتا ہے ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مسلسل کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ خدا کے فضل سے جاری رہے گا لیکن ہر لکھنے والا اپنی تصنیف مکمل کر کے اپنے اندر یہی احساس پاتا ہے۔

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست

"انسان کامل" کے مصنف اس ملک میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے پہلے بھی چند قابل قدر کتب لکھ کر علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب نوجوان مصنف کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہری محبت وعقیدت کے اظہار کے علاوہ ان کے مطالعہ کی وسعت ، مواد کی تلاش میں اُن کی عرق ریزی اور اُن کے ذوقِ تدوین کو بطریقِ احسن ظاہر کرتی ہے ۔ انہوں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے سارے معروف گوشے سامنے آجائیں۔ اس تصنیف میں ایک انسان ایک ہی وقت میں حضورؐ کو اپنی مختلف حیثیتوں میں بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ یوں تو اس کتاب کا ہر باب قابلِ ستائش ہے لیکن خاص طور پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا، اس میں بہت سی نئی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ حضورؐ بحیثیت ذی وقار شہری، بحیثیت افصح العرب خطیب، بحیثیت معلّم انسانیت، بحیثیت کامیاب ترین داعی انقلاب، بحیثیت سپہ سالارِ اعظم، بحیثیت عظیم مدبر و منتظم، بحیثیت بے نظیر مقنّن ومنصف۔

ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں کتابت وطباعت کی غلطیاں بھی نظر سے گزری ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں انہیں درست کر دیا جائے گا۔ معیار طباعت عمدہ ہے۔ البتہ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

کاروانِ حیات | تالیف : نواب مشتاق احمد خان

قیمت : قسم اوّل ۲۴/- روپے ۔ قسم دوم ۲۰/- روپے

صفحات : ۳۸۰

زیر تبصرہ کتاب ایک ایسے زیرک اور صاحبِ علم شخص کی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کی دلچسپ داستان ہے جس نے خلوص، شرافت اور دیانت کا زادِ سفر لے کر اپنی حیات (باقی دیکھیے صفحہ ۴۱)

ضمیمہ ماہنامہ ترجمان القرآن - رجسٹرڈ - ایل نمبر ۵۳۴۰

باسمہ تعالیٰ

ماہنامہ الحسنات

۴- اے ذیلدار پارک اچھرہ ، لاہور

مکرمی و محترمی السلام علیکم و رحمۃاللہ

جنوری ۱۹۷۵ میں ''الحسنات'' کا خاص نمبر ''سالنامہ'' منظر عام پر آ رہا ہے - یہ ایک دعوتی اور تحریکی جریدہ ہے اس کی توسیع اشاعت میں بھرپور حصہ لینا انشاء اللہ باعث اجر ہوگا - ہمیں امید ہے آپ اس سلسلہ میں خصوصی تعاون فرما کر اس کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنائیں گے - جس جگہ ایجنسی نہیں ہے وہاں ایجنسی قائم کرنے میں تعاون فرمائیں - اشتہارات کیلئے بھی کوشش کیجئے -

خاص نمبر کی خصوصیات

* مشہور اہل قلم حضرات کی نگارشات - مستقل عنوانات کے علاوہ مضامین - افسانے - خاکے - نظمیں اس پرچہ کی زینت ہوں گے - جن سے ہر عمر کے افراد کی ذاتی تربیت اور معاشرے کو پاکیزہ بنانے میں مدد ملے گی - کم پڑھے لکھے مرد و خواتین اور خاص طور پر طلبہ کے لئے بہت مفید ہے نیز اس پرچہ کا ایک حصہ چھوٹے بچوں کے لئے مخصوص ہے سالنامہ میں بچوں کے سلسلہ میں بہت اہم چیزیں آ رہی ہیں -
* انفرادی خریداروں کو زر سالانہ میں یہ خاص نمبر دیا جائیگا انفرادی خریدار رجسٹری مصارف کیلئے -/۱ روپیہ زائد بھجوائیں - صفحات ۸۲ ، نیا خوبصورت ٹائیٹل مع کیلنڈر ۷۵ قیمت فی پرچہ -/۳ روپے زر سالانہ -/۱۰ روپے -

ناظم ادارہ الحسنات - اچھرہ - لاہور -